Rooh-e-Tahqeeq, Vol.04, No.01, Serial No. 11, January – March 2026

Fundamental Theories of International Relations and Urdu Novels: In the Context of Feminism

بین الاقوامی تعلقات کے بنیادی نظریات اور اردو ناول: تانیثیت کے تناظر میں

Asad Mehmood Khan
PhD Scholar (Urdu), Lahore Leads University, Lahore
assadphdir@gmail.com

Dr. Muhammad Ataullah
HOD, Department of Urdu, Lahore Leads University, Lahore

Abstract:
This research article re-examines the relationship between foundational theories of International Relations and the Urdu novel through a feminist lens. Classical paradigms such as Realism, Liberalism, and Constructivism primarily focus on state, power, interest, and identity, yet the gendered dimension within these theoretical frameworks often remains underexplored. The study argues that the silences embedded in dominant IR narratives become visibly articulated within the creative discourse of the Urdu novel. Through textual analysis of selected Urdu novels, the paper demonstrates that war, colonialism, partition, and global power dynamics profoundly shape feminine subjectivity, collective memory, and cultural identity. Employing feminist critique, the study reveals that notions of national interest and state sovereignty are not gender-neutral constructs but are deeply embedded in patriarchal structures. The Urdu novel thus emerges as an alternative epistemic space that humanizes and ethically expands the theoretical boundaries of International Relations. The central argument asserts that feminist analysis offers a necessary intellectual intervention for rethinking global politics beyond material power, incorporating embodied experiences, emotional economies, and gendered narratives into the study of international relations.

Keywords: International Relations, Feminism, Urdu Novel, Identity, Postcolonial Context, Gender Politics

(۱)

بین الاقوامی تعلقات کی علمی روایت بنیادی طور پر طاقت، ریاست اور بقا کے گرد تشکیل پاتی رہی ہے۔ جدید عہد میں جب یورپی ریاستی نظام ویسٹ فیلیا کے معاہدے کے بعد مستحکم ہوا تو ریاست کو عالمی سیاست کا مرکزی فاعل قرار دیا گیا۔ اس تصور نے عالمی نظام کو ایک ایسی انارکی ساخت کے طور پر دیکھا جس میں کوئی بالادست مقتدر قوت موجود نہیں اور ہر ریاست اپنی سلامتی اور مفاد کے تحفظ کے لیے سرگرم رہتی ہے۔ بیسویں صدی کی دو عالمی جنگوں نے اس فکری رجحان کو مزید تقویت دی اور حقیقت پسندی ایک غالب نظریہ بن کر سامنے آئی۔ طاقت کو ریاستی بقا کا لازمی وسیلہ سمجھا گیا اور اخلاقیات کو اکثر عملی سیاست کے مقابل ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس تناظر میں عالمی سیاست ایک ایسے میدان کے طور پر دیکھی گئی جہاں مفادات کی کشمکش اور توازنِ طاقت فیصلہ کن عوامل تھے۔ بین الاقوامی تعلقات کی کلاسیکی روایت طاقت، ریاست اور بقا کے گرد تشکیل پاتی رہی ہے۔ حقیقت پسندی نے عالمی سیاست کو ایک ایسے انارکی نظام کے طور پر پیش کیا جہاں ہر ریاست اپنی سلامتی اور مفاد کے تحفظ کے لیے کوشاں ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کی کلاسیکی روایت میں طاقت کو

محض ایک وسیلہ نہیں بلکہ سیاسی عمل کا بنیادی محرک سمجھا گیا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے تجربات نے اس تصور کو مزید تقویت دی کہ عالمی نظام میں کوئی بالادست مقتدر قوت موجود نہیں جو ریاستوں کے طرزِ عمل کو حتمی طور پر منضبط کر سکے۔ ویسٹ فیلیائی ریاستی نظام کے استحکام کے بعد خود مختاری، قومی مفاد اور بقا جیسے تصورات بین الاقوامی سیاست کے مرکزی ستون بن گئے۔ اس فکری فضا میں اخلاقیات کو اکثر ثانوی حیثیت دی گئی اور عملی سیاست کو مفادات کے توازن اور طاقت کی کشمکش کے تناظر میں سمجھا گیا۔ کلاسیکی حقیقت پسندی کے مطابق ریاست ایک عقلی فاعل ہے جو اپنے مفاد اور سلامتی کے تحفظ کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کرتی ہے، کیونکہ عالمی سیاست کی ساخت انارکی پر مبنی ہے۔ اسی نظریاتی پس منظر میں ہانس جے مورگنتھاؤ نے عالمی سیاست کی ماہیت کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا:

"بین الاقوامی سیاست، تمام سیاست کی طرح، اقتدار کے لیے جدوجہد ہے۔"(۱)

یہ بیان کلاسیکی ریئلزم کی اساس فراہم کرتا ہے، جہاں طاقت کو بین الاقوامی سیاست کا فوری اور عملی مقصد قرار دیا جاتا ہے، اور ریاستی بقا کو اسی طاقت کے حصول اور تحفظ سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ مولانا مودودی، ریاست اور سماجی تعلق کو یوں بیان کرتے ہیں:

"ریاست کا اصل مقصد اپنی حاکمیت کا تحفظ اور اپنی حدود میں نظم قائم رکھنا ہے۔" (۲)

تانیثی مفکرین نے استدلال کیا کہ عالمی سیاست کی زبان، اس کی ساخت اور اس کے مرکزی تصورات دراصل مردانہ تجربے سے اخذ کیے گئے ہیں، جس کے نتیجے میں عورت بطور فاعل یا تو غائب ہے یا حاشیے پر ہے۔ جوڈتھ این ٹکنر، اسی سیاق میں رقمطراز ہے:

"تانیثی زاویۂ نظر یہ آشکار کرتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے روایتی نظریات کی بنیادیں کس قدر گہرے صنفی مفروضوں پر قائم ہیں۔" (۳)

دوسری جانب انور پاشا لکھتے ہیں:

"آج تانیثیت نسوانی شعور کی حیثیت سے محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک تنقیدی زاویہ ہے، جو فکر و فن کے متون میں نئے مباحث کو جنم دیتا ہے۔ تانیثیت کے ذریعے نہ صرف خواتین کے کردار اور وجود کو آواز اور شناخت ملتی ہے بلکہ معاشرے کے تمام اداروں اور مباحث میں مرد و زن کے تعلقات کا نیا مفہوم سامنے آتا ہے۔ اس اعتبار سے تانیثیت محض جنسی امتیاز کے خلاف ایک ردِ عمل نہیں بلکہ فکری اور سماجی تبدیلی کا ایک وسیع تر بیانیہ ہے۔"(۴)

تاہم وقت کے ساتھ یہ احساس بھی گہرا ہوا کہ عالمی سیاست صرف عسکری قوت یا مادی وسائل تک محدود نہیں۔ سرد جنگ کے تجربے، نو آبادیاتی نظام کے خاتمے اور عالمی اداروں کے قیام نے لبرل فکر کو نئی اہمیت دی۔ بین الاقوامی تنظیمیں، اقتصادی انحصار، سفارتی تعاون اور قانون کی بالادستی جیسے تصورات سامنے آئے۔ اس کے باوجود یہ تمام نظریاتی مباحث بنیادی طور پر ریاستی سطح پر مرکوز رہے۔ فرد، سماج اور ثقافتی ساختیں اکثر پس منظر میں چلی گئیں۔ عالمی نظام کو سمجھنے کی کوشش میں انسانی تجربہ، جذبات، سماجی یادداشت اور صنفی پہلو نسبتاً کم زیر بحث آئے۔ خصوصاً سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب عالمی سیاست میں نئے مباحث ابھرے تو شناخت، ثقافت اور نارمز کو اہمیت دی گئی۔ تعمیریت نے یہ دعویٰ کیا کہ

ریاستی مفادات سماجی تعامل کے ذریعے تشکیل پاتے ہیں۔ مگر تانیثی مفکرین نے اس نکتے کو مزید وسعت دیتے ہوئے کہا کہ یہ شناختیں خود صنفی ساخت رکھتی ہیں۔ قوم، عزت، تحفظ اور سلامتی جیسے تصورات میں عورت کو اکثر علامتی حیثیت دی جاتی ہے، مگر فیصلہ سازی کے مراکز میں اس کی عملی شرکت محدود رہتی ہے۔ لوراسو جوبرگ لکھتی ہیں:

"سلامتی کو اُن صنفی ساختوں سے الگ سمجھا ہی نہیں جاسکتا جو عدم تحفظ اور تحفظ دونوں کی تشکیل کرتی ہیں۔"(۵)

تانیثیت نے بین الاقوامی تعلقات کے روایتی بیانیے پر سوال اٹھایا کہ عالمی سیاست کی زبان کیوں زیادہ تر مذکر استعاروں سے بھری ہوئی ہے۔ طاقت کو قوت، جارحیت اور تسلط کے معنوں میں کیوں بیان کیا جاتا ہے۔ ریاست کو محافظ اور سپاہی کے استعارے میں کیوں دیکھا جاتا ہے۔ جنگ اور امن کے مباحث میں عورت کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال محض نمائندگی کا نہیں بلکہ علمیات کا سوال ہے۔ اگر نظریات کی تشکیل مردانہ تجربے کے گرد ہوئی ہے تو کیا وہ عالمی حقیقت کی مکمل تصویر پیش کر سکتے ہیں۔ تانیثی تنقید نے واضح کیا کہ عالمی سیاست کے اثرات سب سے گہرے طور پر ان طبقات پر مرتب ہوتے ہیں جو فیصلہ سازی کے مراکز میں شامل نہیں ہوتے۔ مہاجرت، جنگی تشدد، اقتصادی پابندیاں اور سیاسی عدم استحکام کا بوجھ اکثر نسوانی وجود پر زیادہ شدت سے پڑتا ہے۔ اس طرح جنس ایک پوشیدہ مگر مؤثر عامل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ تانیثی فکر نے روایتی نظریات سے سوال کیا کہ طاقت کی تعریف کیوں مذکر تجربے پر مبنی ہے۔ اس نے واضح کیا کہ عالمی سیاست کی ساخت صنفی جہت رکھتی ہے۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

"تانیثیت نے ابتدا ہی سے مردانہ بالادستی کے علمی اور سیاسی ڈھانچوں کو چیلنج کیا۔ اسی تنقیدی روایت نے آگے چل کر بین الاقوامی تعلقات کے روایتی بیانیے کو بھی سوال کے کٹہرے میں کھڑا کیا اور واضح کیا کہ عالمی سیاست کی زبان، اس کے استعارے اور اس کی ساخت صنفی جہت سے خالی نہیں بلکہ اسی سے تشکیل پاتے ہیں۔" (۶)

جنوبی ایشیا کے تاریخی تجربات اس بحث کو مزید پیچیدہ اور بامعنی بنا دیتے ہیں۔ نو آبادیاتی دور نے ریاست، شناخت اور طاقت کے تصورات کو نئی صورت دی۔ سامراجی حکمت عملیوں نے نہ صرف سیاسی سرحدیں کھینچیں بلکہ ثقافتی اور سماجی ڈھانچوں کو بھی متاثر کیا۔ آزادی کی تحریکوں نے قومیت کے بیانیے کو جنم دیا جس میں عورت کو اکثر علامتی کردار دیا گیا۔ وہ کبھی قوم کی عزت کی نمائندہ بنی اور کبھی قربانی کی علامت۔ تقسیم، ہجرت اور بعد ازاں علاقائی جنگوں نے اجتماعی یادداشت کو زخم آلود کیا۔ یہ تمام تاریخی مراحل بین الاقوامی تعلقات کے نظریاتی مباحث سے الگ نہیں بلکہ ان کے عملی مظاہر ہیں۔ طاقت کی عالمی حرکیات مقامی معاشروں میں گہرے سماجی اور نفسیاتی اثرات پیدا کرتی ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا عالمی سیاست کو صرف سفارتی بیانات اور ریاستی دستاویزات کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ یا پھر اس کے اثرات کو جانچنے کے لیے ہمیں سماجی اور ثقافتی متون کی طرف بھی رجوع کرنا ہوگا۔ ادب بطور فن انسانی تجربے کی جامع ترجمانی کرتا ہے۔ یہ محض تخیل کا میدان نہیں بلکہ تاریخی اور سیاسی شعور کا آئینہ بھی ہے۔ جب ریاستی فیصلے عوامی زندگی کو متاثر کرتے ہیں تو ان کی بازگشت سماجی بیانیوں میں سنائی دیتی ہے۔ ادب اس بازگشت کو محفوظ کرتا ہے۔ وہ طاقت کی سرکاری زبان کے بالمقابل انسانی تجربے کی زبان مہیا کرتا ہے۔

نو آبادیاتی دور نے ریاست اور شناخت کے تصورات کو نئی صورت دی۔ سامراجی حکمت عملیوں نے ثقافتی اور سماجی ڈھانچوں کو بھی متاثر کیا۔ ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

"سامراجیت آج بھی ایک طاقتور تشکیل دینے والا اثر رکھتی ہے۔" (۷)

جب کہ جارج لوکاکس، ادب کو انسانی تجربے کی جامع ترجمانی تصور کرتے ہیں جو سیاسی و سماجی تحولات کی بازگشت کو محفوظ رکھتا ہے، وہ رقمطراز ہیں:

"ناول پورے معاشرے کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" (۸)

تانیثی تناظر اس ادبی میدان کو مزید معنی خیز بنا دیتا ہے۔ اگر عالمی سیاست صنفی ساخت سے متاثر ہے تو اس کے اثرات بھی صنفی سطح پر ظاہر ہوں گے۔ ادب ان اثرات کو کرداروں کی داخلی کشمکش، شناختی بحران اور سماجی رویوں کے ذریعے سامنے لاتا ہے۔ اس طرح ادب عالمی سیاست کا متوازی ریکارڈ بن جاتا ہے۔ یہاں ریاستی مفاد کے بجائے انسانی وقار اور جذباتی حقیقت کو مرکزی حیثیت ملتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں بین الاقوامی تعلقات کے نظریات اور ادبی مطالعہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ تانیثی تنقید نے ادب کو صنفی ساخت کے تناظر میں پڑھنے کی روایت قائم کی اور بتایا کہ بیانیہ غیر جانب دار نہیں ہوتا۔ جان والچ سکاٹ لکھتے ہیں:

"جنس طاقت کے تعلقات کو معنی دینے کا ایک طریقہ ہے۔" (۹)

فاطمہ حسن رقمطراز ہیں:

"عورت جنگ سے نفرت کرتی ہے، اسے اس کی مذمت کرنا چاہیے۔ مگر وہی نسل اور قلم کی بدولت بچی بھی انسانی روح ہے۔ ادب کا کام مردوں کی روح انسانی کی جستجو ہے، جو انکار کرنے سے، ڈھند اور معنی مسائل میں مداخلت اختیار کرکے، مردہ حالات کو زندہ بناتے ہیں۔ ادب اور خصوصاً عورت ادب ان مسائل کو کسانوں کی طرح نہیں، بلکہ اپنے نظریے کے طور پر بیان کرتا ہے۔" (۱۰)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ جنگ اور طاقت کی رسمی زبان کے مقابل ادب انسانی روح کی بازیافت کا ذریعہ بنتا ہے۔ عورت یہاں محض علامت نہیں بلکہ وہ فکری اور اخلاقی قوت ہے جو مردہ حالات کو زندہ معنی دیتی ہے۔

اس طرح عالمی سیاست کے نظریاتی مباحث اور جنوبی ایشیا کے تاریخی تجربات ادب کے ذریعے ایک ایسے انسانی افق پر منتقل ہوتے ہیں جہاں طاقت کی حرکیات نسوانی شعور میں اپنی اصل صورت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ جدید عہد میں عالمگیریت، ڈیجیٹل روابط اور اقتصادی انحصار نے عالمی سیاست کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ سرحدیں بظاہر نرم ہو رہی ہیں مگر طاقت کی نئی صورتیں جنم لے رہی ہیں۔ ثقافتی اثرورسوخ، ابلاغیاتی طاقت اور بیانیاتی تسلط نے بین الاقوامی تعلقات کی تعریف کو وسیع کیا ہے۔ ان نئی حرکیات میں بھی صنفی پہلو موجود ہے۔ میڈیا میں عورت کی نمائندگی، عالمی محنتی منڈی میں نسوانی کردار اور جنگی تنازعات میں خواتین کی شرکت یا مظلومیت جیسے موضوعات عالمی سیاست کا حصہ ہیں۔ اس لیے نظریاتی مباحث کو اب صرف عسکری یا اقتصادی زاویے تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی فکری پس منظر میں ادبی متون کا مطالعہ ہمیں عالمی سیاست کے انسانی اور اخلاقی پہلوؤں تک لے جاتا ہے۔ اگلے مرحلے میں یہ بحث اس امر کی جانب منتقل ہوگی کہ کس طرح اردو ناول اس تاریخی اور نظریاتی تناظر کو اپنے بیانیے میں جذب کرتا ہے اور کس طرح تانیثی تنقید کے ذریعے ان بیانیوں کو بین الاقوامی تعلقات کے مباحث سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔

(۲)

بین الاقوامی تعلقات کی تانیثی تعبیر جب اردو ناول کے بیانیے سے مربوط کی جاتی ہے تو عالمی سیاست کی ایک ایسی تہ دار تصویر سامنے آتی ہے جو محض ریاستی مفاد یا عسکری حکمتِ عملی تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسانی جسم، سماجی ساخت اور یادداشت کی سطح تک اترتی ہے۔ کلاسیکی نظریات میں ریاست ایک خود مختار اور عقلی فاعل کے طور پر سامنے آتی ہے، مگر ناول میں یہی ریاست انسانی رشتوں کو متاثر کرنے والی قوت بن جاتی ہے۔ عورت کا وجود یہاں بین الاقوامی سیاست کی غیر مرئی سطحوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جب سرحدیں بنتی یا ٹوٹتی ہیں تو ان کا پہلا اثر گھر کی دہلیز پر پڑتا ہے۔ یہاں سیاست خارجہ کا فیصلہ، سرحد کی کھینچی ہوئی لکیر یا جنگ کا اعلان محض جغرافیائی تبدیلی نہیں بلکہ نجی زندگی میں در آنے والی دراڑ ہے۔ اردو ناول کی تاریخ میں تانیثی شعور کسی ایک منظم تحریک کے طور پر ابتدا ہی سے موجود نہیں تھا، مگر نسوانی وجود کی پیچیدگی، اس کی سماجی قید اور اس کی داخلی خودی کا اظہار مختلف ادوار میں مختلف صورتوں میں سامنے آتا رہا۔ ان متون میں عورت کبھی روایت کی اسیر ہے، کبھی بغاوت کی علامت، کبھی تہذیب کی محافظ اور کبھی اپنی شناخت کی خود خالق۔ تانیثی مطالعہ ان کرداروں کو محض اخلاقی یا رومانی پیرائے میں نہیں دیکھتا بلکہ اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ وہ کس طرح سماجی، سیاسی اور تہذیبی طاقت کے ڈھانچوں سے مکالمہ کرتی ہیں۔

"اماں! میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر کوئی کرنے نہیں دیتا۔" (۱۱)

"آنگن" میں خدیجہ مستور نے تقسیم کے سیاسی پس منظر کو گھریلو فضا کے اندر سمو دیا ہے۔ یہاں عورت صرف ایک تماشائی نہیں بلکہ تاریخ کے کرب کی براہِ راست شریک ہے۔ آنگن ایک استعارہ بن جاتا ہے—ایسا آنگن جو سیاسی نظریات کی کشمکش سے تقسیم ہو رہا ہے۔ عالیہ کا کردار اس داخلی تقسیم کی علامت ہے، جہاں قومی سیاست اور ذاتی خواہشات ٹکرا جاتی ہیں۔ ایک مقام پر وہ کہتی ہے:

"اماں! میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر کوئی کرنے نہیں دیتا۔" (۱۲)

یہ جملہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ عورت سیاسی تبدیلی کے بیچ اپنی جگہ کی تلاش میں ہے۔ تانیثی تناظر میں آنگن گھر اور ریاست کے درمیان ایک علامتی ربط قائم کرتا ہے۔ "ٹیڑھی لکیر"، میں عصمت چغتائی نے عورت کی نفسیاتی اور سماجی آزادی کو بے باکی سے پیش کیا۔ شمیم کا کردار روایت کے خلاف بغاوت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ "امراؤ جان ادا"، میں مرزا ہادی رسوا نے طوائف کے کردار کو تہذیبی اور سماجی سطح پر ایک پیچیدہ شناخت کے طور پر پیش کیا۔ یہ کردار مردانہ سماج کی ساخت کو اندر سے جانتا ہے اور اس کے تضادات کو آشکار کرتا ہے۔ تانیثی مطالعہ امراؤ جان کو محض رومانوی کردار نہیں بلکہ ایک ایسی عورت کے طور پر دیکھتا ہے جو اپنی داستان خود بیان کرتی ہے، یوں وہ بیانیے کی مالک بن جاتی ہے۔ "جیسے دریا"، میں واجدہ تبسم نے نسوانی خواہش اور جسمانی خودی کو جرات کے ساتھ پیش کیا۔ یہاں عورت اخلاقی معیارات کی قیدی نہیں بلکہ اپنی خواہش کی پہچان رکھتی ہے۔ "گہن"، میں عورت کے جذباتی اور سماجی استحصال کو داخلی خود کلامی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں خاموشی بھی احتجاج کی صورت اختیار کرتی ہے۔ پریم چند کے ناولوں، خصوصاً "گؤدان"، میں عورت کا کردار دیہی اور معاشی جبر کے تناظر میں سامنے آتا ہے۔ دھنیا جیسی عورتیں طبقاتی استحصال کے بیچ استقامت کی علامت ہیں۔ ایک مقام پر کہا گیا ہے:

"پنجو! گریب کو ستا کر سکھ نہ پاؤ گے، اتنا سمجھ لینا۔ ہم تو مٹ جائیں گے، کون جانے کہ اس گاؤں میں رہیں یا نہ رہیں، مگر میرا اسراپ تم کو بھی جرور جرور لگے گا۔"(۱۳)

یہ جملہ عورت کی قربانی اور سماجی ناانصافی کو اجاگر کرتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس"، میں عورت کو اخلاقی اصلاح کے قالب میں پیش کیا گیا۔ اگرچہ یہ بیانیہ اصلاحی ہے، مگر اس میں عورت کی تعلیم اور شعور کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اکبری اور اصغری کے کردار اس بات کی علامت ہیں کہ عورت کی تربیت کو قومی اصلاح سے جوڑا گیا۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" میں تاریخ کا بہاؤ فرد کی ذات میں اترتا ہے۔ ناول میں تہذیبی تسلسل اور سیاسی تغیر کے بیچ انسانی بے بسی یوں ابھرتی ہے کہ سیاسی اور تاریخی تغیرات فرد کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، اور عورت اکثر اس تبدیلی کی خاموش مگر گہری شاہد بنتی ہے۔ تاریخ کا دباؤ اس کے وجود میں جذب ہو کر اجتماعی یادداشت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں"، میں تقسیم کا سانحہ عورت کے جسم اور عزت کے استعارے کے ذریعے بیان ہوتا ہے۔ ناول میں ایک جگہ درد کی شدت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ریاستی سرحدوں کی تشکیل دراصل انسانی رشتوں کی شکست وریخت ہے۔ عورت کا وجود یہاں قومی غیرت اور اجتماعی کرب دونوں کی علامت بن جاتا ہے، گویا عالمی سیاست کی ضرب سب سے پہلے اسی پر پڑتی ہے۔ انتظار حسین کے ناول "بستی"، میں ہجرت اور بے وطنی کی کیفیت یادداشت کے استعارے میں ڈھلتی ہے جہاں سرحد کی تبدیلی خارجی نہیں بلکہ داخلی زلزلہ ہے۔ عورت اس داخلی زلزلے کی امین ہے؛ وہ نسلوں تک اس کرب کو منتقل کرتی ہے۔ یوں عالمی سیاست کا اثر محض سفارتی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ نسوانی وجود میں رچ بس جاتا ہے۔

اسی تناظر میں شبنم آرا تانیثیت کو صرف ایک ادبی یا جذباتی اصطلاح نہیں بلکہ شعوری مزاحمت اور فکری احتجاج کی صورت میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کی محکومی کسی ایک سطح تک محدود نہیں بلکہ خاندان، معیشت اور وسیع تر سماجی نظام میں پیوست ہے، وہ لکھتی ہیں:

"تانیثیت دراصل اُن احساسات کا نام ہے جو اس حقیقت کو آشکار کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ صدیوں سے عورت کو محروم رکھتا آیا ہے، اور ہر سطح پر اسے جبر اور استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پدرسری نظام میں عورت کی محنت، جنسیت اور تولیدی صلاحیت کو خاندان، معیشت اور وسیع تر سماجی ڈھانچے کے مفاد میں استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ اس کی خواہشات اور خودی کو دبایا جاتا ہے۔ یہی شعوری بیداری اور اس جبر کے خلاف فکری احتجاج تانیثیت ہے۔ جب عالمی سیاسی و معاشی ڈھانچے مقامی معاشرت میں سرایت کرتے ہیں تو یہ استحصال مزید پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے، اور عورت کی زندگی اس طاقت کی غیر مساوی تقسیم کا سب سے نمایاں میدان بن جاتی ہے۔"(۱۴)

نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی طاقت کی ساخت کو اگر شہری اور نیم شہری تجربے کے تناظر میں دیکھا جائے تو راجہ گدھ، دشتِ سوس اور آخرِ شب کے ہم سفر جیسے متون اس امر کو نمایاں کرتے ہیں کہ عالمی طاقت کے ڈھانچے کس طرح مقامی معاشرت میں سرایت کرتے ہیں۔ یہاں غربت، طبقاتی تقسیم، اخلاقی بحران اور تہذیبی اضطراب دراصل اس وسیع تر سیاسی معیشت کا تسلسل ہیں جو نوآبادیاتی ورثے اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے جنم لیتی ہے۔ ان ناولوں میں عورت کی زندگی

اسی جبر کا سب سے نمایاں میدان بنتی ہے، جہاں معاشی انحصار، سماجی بدنامی اور جسمانی عدم تحفظ بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ "راجہ گدھ"، میں اخلاقی زوال اور حلال و حرام کی بحث محض مذہبی یا نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک ایسے سماجی بحران کی علامت ہے جس کی جڑیں معاشی ناہمواری اور طاقت کی غیر مساوی تقسیم میں پیوست ہیں۔ عورت یہاں اخلاقی کشمکش کا استعارہ بھی ہے اور اس نظام کی متاثرہ بھی۔ "دشتِ سوس"، میں طاقت اور تاریخ کے تصادم کو نسوانی زاویے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں عورت کا کردار تہذیبی ٹوٹ پھوٹ اور سیاسی جبر کی گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح "آخرِ شب کے ہم سفر"، میں ہجرت اور سرحد پار زندگی کا تجربہ عالمگیریت اور سیاسی جبر کے تناظر میں سامنے آتا ہے۔ عورت کی شناخت مسلسل نقل مکانی اور ثقافتی دباؤ کے بیچ معلق رہتی ہے۔ تانیثی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ تینوں ناول ظاہر کرتے ہیں کہ طاقت کی روایتی تعریف مردانہ تسلط، اختیار اور کنٹرول سے وابستہ ہے، جبکہ عورت کا وجود مزاحمت، برداشت اور بقا کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ عالمی سیاسی معیشت کی ساخت جب مقامی سماج میں منتقل ہوتی ہے تو اس کا سب سے گہرا اثر نسوانی زندگی پر پڑتا ہے۔ یوں ادبی بیانیہ اس عالمی ڈھانچے کو انسانی اور صنفی سطح پر قابلِ فہم بناتا ہے اور دکھاتا ہے کہ بین الاقوامی سیاست کی حقیقت عورت کے تجربے کے بغیر مکمل نہیں۔

اس تناظر میں اردو ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عقیل احمد اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ سیاسی تبدیلیاں صرف جغرافیائی حدود تک محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ معاشرتی اور ثقافتی ساختوں کو بھی از سرِ نو تشکیل دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک نو آبادیاتی ورثہ اور اس کے بعد کی سیاسی صورتِ حال نے مقامی سماج کی داخلی ترتیب کو گہرے طور پر متاثر کیا، اور یہی اثرات ادبی بیانیے میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی پس منظر میں وہ لکھتے ہیں:

> "نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی طاقت کی ساخت صرف سیاسی سرحدوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ شہری اور نیم شہری زندگی کے معاشی، اخلاقی اور تہذیبی ڈھانچوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ اس سرایت کا سب سے نمایاں میدان عورت کا وجود ہے، جہاں عالمی سیاسی معیشت کی غیر مساوی تقسیم روزمرہ زندگی کے جبر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ طاقت کی یہ ساخت سب سے پہلے عورت کے جسم، اس کی محنت اور اس کی شناخت پر اپنا تسلط قائم کرتی ہے۔" (۱۵)

تہذیبی شناخت اور تاریخی شعور کے تناظر میں فردوس بریں، کاروانِ حیات اور حاصل گھاٹ ایسے متون ہیں جو ماضی کے استعارے کے ذریعے حال کے سیاسی اور تہذیبی بحران کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں تاریخ محض واقعاتی تسلسل نہیں بلکہ قومی خودی، اخلاقی وقار اور اجتماعی یادداشت کی تشکیل کا ذریعہ ہے۔ مگر تانیثی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ تشکیل صنفی علامتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ عورت کو اکثر تہذیب کی پاکیزگی، قومی غیرت یا اخلاقی استحکام کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، گویا قوم کا عروج یا زوال اس کے کردار میں مجسم ہو گیا ہو۔ "فردوس بریں"، میں ماضی کی اسلامی تہذیب کا بیان ایک مثالی سماج کے تصور کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہاں عورت شرافت، حیا اور تہذیبی استقامت کی نمائندہ ہے۔ اسی طرح "حاصل گھاٹ"، میں داخلی روحانی بحران اور سماجی انتشار کو تہذیبی کمزوری کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ عورت کا کردار یہاں بھی محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی معنویت رکھتا ہے۔ یوں یہ ناول ماضی کے استعارے کے ذریعے حال کے عالمی سیاسی دباؤ کو بیان کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ قومی عروج یا زوال کو نسوانی کردار میں مجسم کر

دینا ایک صنفی عمل ہے۔ تانیثی بین الاقوامی سیاست کے تناظر میں یہ ناول واضح کرتے ہیں کہ عالمگیریت کے اثرات صنفی طور پر یکساں نہیں۔ مرد کے لیے نقل مکانی اکثر پیشہ ورانہ کامیابی یا سماجی وسعت کا ذریعہ بنتی ہے، جبکہ عورت کے لیے یہ روایت اور جدیدیت کے درمیان مسلسل توازن کی آزمائش ہے۔ اس پر نئی ثقافتی توقعات بھی عائد ہوتی ہیں اور پرانی ذمہ داریاں بھی باقی رہتی ہیں۔ یوں عالمگیریت عورت کو نئے مواقع کے ساتھ نئے استحصال بھی دیتی ہے۔ اردو ناول اس پیچیدہ صورتِ حال کو جذباتی اور انسانی سطح پر پیش کرتا ہے، جہاں عالمی سیاست کی حرکیات نسوانی شناخت کی جدوجہد میں مجسم ہو جاتی ہیں۔

(۳)

ان ناولوں کے مجموعی مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ناول عالمی سیاست کی محض عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کی صنفی تمثیل تشکیل دیتا ہے۔ ریاستی فیصلے، جنگی تنازعات، نو آبادیاتی ورثہ، سرد جنگ کا نظریاتی دباؤ اور عصرِ حاضر کی عالمگیریت ، یہ سب عوامل ادبی بیانیے میں عورت کے وجود کے ذریعے معنی پاتے ہیں۔ سیاسی واقعات جب ادبی متن میں منتقل ہوتے ہیں تو وہ محض تاریخی حقائق نہیں رہتے بلکہ انسانی تجربے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس ڈھلنے کا سب سے گہرا اور پیچیدہ مرحلہ نسوانی وجود میں وقوع پذیر ہوتا ہے، جہاں طاقت کی تجریدی حرکیات روزمرہ زندگی، شناخت اور جذباتی ساخت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اردو ناول اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عالمی سیاست کا اثر سب سے پہلے گھر کی فضا میں محسوس ہوتا ہے۔ سرحد کی لکیر کھینچی جائے تو عورت کی سماجی حیثیت متاثر ہوتی ہے؛ جنگ ہو تو اس کا جسم اور عزت سیاسی استعارہ بن جاتے ہیں؛ معاشی بحران آئے تو اس کی محنت اور قربانی غیر مرئی رہ جاتی ہے؛ اور عالمگیریت کے دباؤ میں وہ روایت اور جدیدیت کے بیچ توازن قائم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یوں عورت نہ صرف متاثرہ فریق ہے بلکہ سیاسی اور تہذیبی معنی کی تشکیل کا مرکزی مقام بھی ہے۔ یہ تمثیل اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ قومی عروج و زوال، تہذیبی بحران اور نظریاتی تصادم کو اکثر نسوانی کردار کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے، گویا عورت اجتماعی ضمیر کی نمائندہ ہو۔

تانیثی بین الاقوامی تعلقات کے لیے یہ ادبی سرمایہ اس لیے اہم ہے کہ یہ طاقت کے رسمی اور مردانہ بیانیے کو انسانی سطح پر چیلنج کرتا ہے۔ کلاسیکی نظریات طاقت کو عسکری قوت، سفارتی حکمتِ عملی یا اقتصادی بالادستی کے تناظر میں دیکھتے ہیں، مگر اردو ناول دکھاتا ہے کہ طاقت کی اصل آزمائش انسانی رشتوں میں ہوتی ہے۔ جب سیاسی مفاد کے نام پر فیصلے کیے جاتے ہیں تو ان کے نتائج سب سے زیادہ ان طبقات پر مرتب ہوتے ہیں جو فیصلہ سازی کے مراکز میں شامل نہیں ہوتے، اور عورت انہی طبقات میں سرِفہرست ہے۔ اس طرح ادبی بیانیہ طاقت کی غیر مساوی تقسیم کو نمایاں کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ صنفی ساخت عالمی سیاست کی بنیادی جہت ہے۔ مزید برآں، اردو ناول تاریخی دستاویز کی طرح واقعات کو محفوظ نہیں کرتا بلکہ انہیں انسانی معنی عطا کرتا ہے۔ یہ ماضی کے سانحات کو یادداشت میں زندہ رکھتا ہے اور حال کے بحران کو اخلاقی سوال میں تبدیل کرتا ہے۔ تانیثی تناظر میں یہ یادداشت محض جذباتی نوحہ نہیں بلکہ سیاسی شعور کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ عورت کا وجود یہاں تاریخ کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے اور مستقبل کی امید بھی۔ یوں اردو ناول عالمی سیاست کو انسانی اور ثقافتی تناظر میں سمجھنے کا ایک منفرد ذریعہ بن جاتا ہے، جہاں ریاستی بیانیے کے مقابل نسوانی تجربہ ایک متبادل علمیات پیش کرتا ہے۔ نتیجتاً کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول عالمی سیاست کی صنفی تمثیل فراہم کرتے ہوئے بین الاقوامی تعلقات کے نظریاتی

مباحث کو وسعت دیتا ہے۔ وہ یہ باور کراتا ہے کہ طاقت کی حرکیات کو سمجھے بغیر جنس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور جنس کو سمجھے بغیر عالمی سیاست کی تفہیم مکمل نہیں ہوتی۔ اس طرح اردو ناول نہ صرف ادبی متن ہے بلکہ تانیثی بین الاقوامی تعلقات کے لیے ایک ثقافتی اور انسانی حوالہ بھی ہے، جہاں عالمی تاریخ نسوانی تجربے میں مجسم ہو کر سامنے آتی ہے اور طاقت کا تصور ایک اخلاقی اور انسانی سوال میں بدل جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Morgenthau, H. J. (1948). Politics among nations: The struggle for power and peace. New York, NY: Alfred A. Knopf.

(۲) مودودی، اَبوالاعلیٰ، (۱۹۴۰ء)، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ اول)، پٹھان کوٹ: مکتبہ جماعتِ اسلامی، ص ۴۵۔

(3) Tickner, J. A. (2001). Gendering World Politics. New York, NY: Columbia University Press, p. 12.

(۴) پاشا، انور، (۲۰۱۴ء)، تانیثیت اور ادب، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ص ۳۶۔

(5) Sjoberg, L. (2010). Gender and International Security. London: Routledge, p. 7.

(۶) اشرفی، وہاب (۲۰۱۴ء)، تانیثیت اور مابعد جدیدیت، مشمولہ: تانیثیت اور ادب، مرتبہ: انور پاشا، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ص ۳۳۔

(7) Said, E. W. (1993). Culture and Imperialism. New York, NY: Knopf, p. 8.

(8) Lukács, G. (1971). The Theory of the Novel. Cambridge, MA: MIT Press, p. 56.

(9) Scott, J. W. (1986). Gender: A useful category of historical analysis. American Historical Review, 91(5), p. 1067.

(۱۰) فاطمہ حسن (۲۰۱۴ء)، برصغیر کے ادب میں صنفیت کے مسائل، مشمولہ: تانیثیت اور ادب، مرتبہ: انور پاشا، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ص ۲۸۳۔

(۱۱) کبیر، فہمیدہ، (۱۹۹۲ء)، اردو ناول میں عورت کا تصور: نذیر احمد سے پریم چند تک، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ص ۲۳۔

(۱۲) مستور، خدیجہ (۱۹۸۴ء)، آنگن، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ص ۲۳۷۔

(۱۳) چند، پریم (۱۹۶۶ء)، گئودان، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ص ۲۰۵۔

(۱۴) شبنم آرا (۲۰۱۴ء)، تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول، مشمولہ: تانیثیت اور ادب، مرتبہ: انور پاشا، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ص ۳۶۵۔

(۱۵) احمد، عقیل (۱۹۸۷ء)، اردو ناول اور تقسیمِ ہند، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ص ۱۷۱۔

References

(1) Morgenthau, H. J. (1948). Politics among Nations: The Struggle for Power and Peace. New York, NY: Alfred A. Knopf.

(2) Maududi, Abul A'la. (1940). Musliman aur Maujooda Siyasi Kashmakash (Hissa Awwal). Pathankot: Maktaba Jamaat-e-Islami, p. 45.

(3) Tickner, J. A. (2001). Gendering World Politics. New York, NY: Columbia University Press, p. 12.

(4) Pasha, Anwar. (2014). Tanishiyat aur Adab. Delhi: Arshiya Publications, p. 36.

(5) Sjoberg, L. (2010). Gender and International Security. London: Routledge, p. 7.

(6) Ashrafi, Wahab. (2014). Tanishiyat aur Mabaad Jadeediyat. Mashmoola: Tanishiyat aur Adab, Murattib: Anwar Pasha. Delhi: Arshiya Publications, p. 33.

(7) Said, E. W. (1993). Culture and Imperialism. New York, NY: Knopf, p. 8.

(8) Lukács, G. (1971). The Theory of the Novel. Cambridge, MA: MIT Press, p. 56.

(9) Scott, J. W. (1986). Gender: A Useful Category of Historical Analysis. American Historical Review, 91(5), p. 1067.

(10) Fatima Hasan. (2014). Barsagheer ke Adab mein Sanfiyat ke Masail. Mashmoola: Tanishiyat aur Adab, Murattib: Anwar Pasha. Delhi: Arshiya Publications, p. 283.

(11) Kabir, Faheema. (1992). Urdu Novel mein Aurat ka Tasawwur: Nazir Ahmad se Premchand tak. Nai Dilli: Maktaba Jamia Limited, p. 23.
(12) Mastoor, Khadija. (1984). Aangan. Nai Dilli: Modern Publishing House, p. 237.
(13) Premchand. (1966). Godaan. Nai Dilli: Maktaba Jamia Limited, p. 205.
(14) Shabnam Ara. (2014). Tanishiyat ke Mubahis aur Urdu Novel. Mashmoola: Tanishiyat aur Adab, Murattib: Anwar Pasha. Delhi: Arshiya Publications, p. 365.
(15) Ahmad, Aqeel. (1987). Urdu Novel aur Taqseem-e-Hind. Nai Dilli: Modern Publishing House, p. 171.

❖❖❖